© rasailojaraid.com

اسلام کا بین الاقوامی قانون ---- ایک تقابلی جائزہ

محمود احمد غازی

جب ہم اسلام کے قانون بین الممالک کا دنیا کے دیگر بین الاقوامی قوانین سے تقابلی مطالعہ اور موازنہ کرتے ہیں تو کئی ایسے پہلو واضح طور پر سامنے آتے ہیں جن کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کا بین الاقوامی قانون اپنے اندر چند ایسے اہم خصائص اور امتیازی اوصاف رکھتا ہے جو اس کے علاوہ کسی اور قانون میں موجود نہیں ہیں۔ لیکن کسی بھی بامعنی تقابلی مطالعے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے دنیا کے بڑے بڑے قوانین میں بین الاقوامی قانون کے احکام و تصورات کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جائے تاکہ اس کی بنیاد پر ایک تقابلی خاکہ تیار کیا جا سکے۔

جب سے اس روئے زمین پر انسانی معاشرہ موجود ہے' معاشرتی آداب اور ریاستی قوانین بھی موجود ہیں۔ جس طرح ایک فرد انفرادی حیثیت سے زندگی نہیں گزار سکتا بلکہ دوسروں سے مل جل کر ہی رہتا ہے اور سب سے میل جول رکھ کر اور لین دین کر کے ہی پر سکون زندگی گزارتا ہے اور اس طرح دوسرے انسانوں کے ساتھ مختلف نوعیت کے کام کاج اور کاروبار میں شامل ہوتا ہے' اسی طرح انسانوں کا کوئی گروہ یا جماعت بھی تنہا' دوسری جماعتوں سے کٹ کر' زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ جب سے انسانوں میں معاشرے اور قبائل موجود ہیں اور جب سے انسانوں نے اپنی تاریخ کو محفوظ کرنا سیکھا ہے اسی وقت سے معاشروں' ریاستوں' مملکتوں' بادشاہتوں کی تاریخ بھی موجود ہے اور اسی وقت سے بین الاقوامی میل جول کے اصول یعنی قانون کی تاریخ بھی موجود ہے۔ اس سلسلے میں کسی بھی قوم کا یہ دعویٰ سو فیصد درست تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ بین الاقوامی تعلقات کے سلسلے میں قوانین کا آغاز سب سے پہلے اس کے ہاں سے ہوا۔ یونانیوں کا بیان ہے کہ بین الاقوامی قوانین کا تصور اور اس کے اصول و ضوابط سب سے پہلے ان کے ہاں پیدا ہوئے۔ ہمارے پڑوس میں ہندو مصنفین کا دعویٰ ہے کہ بین الاقوامی قوانین نے ان کے ہاں سے جنم لیا۔ یہ دونوں دعوے اپنی اپنی جگہ جزوی طور پر درست ہو سکتے ہیں' لیکن اس سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ کس قوم نے کب' کس انداز سے' کن مراحل سے گزر کر اور کن بنیادی تصورات کو سامنے رکھ کر بین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الاقوامی قوانین کو جنم دیا اور کس طرح ایک منضبط قانون بین الممالک نے ان کے ہاں وجود پایا۔

انسانوں نے سب سے پہلے قبائل کی سطح پر منظم ہونا سیکھا۔ ایک زمانہ تھا کہ دنیا کے ہر علاقے میں بین الاقوامی تشخص قبیلے سے وابستہ ہوتا تھا' اور ایک شخص کی عالمی پہچان اس کے قبیلے کے حوالے سے ہوتی تھی۔ جزیرہ عرب میں اور یونان میں قبائل کا وجود تاریخ کی ایک معلوم و معروف حقیقت ہے۔ یورپ کے دوسرے ممالک میں' وسطی ایشیا میں' گوبی کے ریگستان میں' افریقہ کے جنگلات میں' غرض ان سب علاقوں میں قبائل ہی کی صورت میں انسان نے اول اول اپنے آپ کو منظم کیا' وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان قبائل نے سیاسی تنظیموں کی شکل اختیار کر لی' سربراہ قبیلہ کو ریاستی سربراہ کے اختیارات حاصل ہو گئے۔ ایک قبیلے کا لین دین دوسرے قبیلے کے ساتھ ہونے لگا' ایک قبیلے کی جنگ دوسرے قبیلے کے ساتھ ہونے لگی' یہ مسائل جب سامنے آئے تو ان کو حل کیے جانے سے نظائر نے جنم لیا اور نظائر نے آگے چل کر قانون کا روپ دھار لیا۔ پھر رفتہ رفتہ ان قوانین کو وقتاً فوقتاً مختلف مفکرین نے مدون کیا۔

جب قبائل نے مختلف مقامات پر مستقل طور پر بس کر مختلف آبادیوں کی شکل اختیار کرنا شروع کی تو شہری مملکتیں وجود میں آئیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ دنیا میں تہذیب و سیاسیات کے الفاظ جس مادہ اور جس ماخذ سے لیے گئے وہ سب کے سب شہریت اور شہر کے معنی رکھتے ہیں۔ عربی زبان میں مدینہ' شہر کے لیے استعمال ہوتا ہے' اسی سے لفظ تمدن نکلا ہے۔ پولیس (polis) یونانی اور رومی زبانوں میں شہروں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ پولیٹیکل سائنس اور polity اسی سے ماخوذ ہے۔ لفظ civilization بھی یہی معنی دیتا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ قبائل نے شہری ریاستوں کی اور شہری ریاستوں نے تمدن کی شکل اختیار کی۔ اور بالآخر بڑے بڑے تمدنوں نے اور بڑی بڑی تہذیبوں نے ایسی سلطنتیں قائم کیں جن کا تذکرہ آج تاریخ میں ملتا ہے۔

لیکن یہ سوال اپنی جگہ بدستور موجود ہے کہ سب سے پہلے کس قوم نے کب بین الاقوامی قوانین مرتب کیے۔ یہاں یہ سوال نہیں ہے کہ بین الاقوامی قوانین کے بارے میں جو کتابیں آج موجود ہیں ان میں سے قدیم ترین کتاب کون سی ہے۔ یہ ایک مختلف سوال ہے۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ دنیا کی قدیم ترین کتابوں میں بھی چاہے وہ مہابھارت یا رامائن جیسی قدیم منظومات ہوں یا وید اور منوسمرتی جیسی قدیم مذہبی قانون کی کتابیں' یا ایلیڈ (Eliad) جیسی قدیم رزمیات ہوں' ارسطو اور افلاطون کی تحریریں ہوں یا جسٹینین کا کوڈ ہو' ان تمام قدیم کتابوں میں بین الاقوامی تعلقات سے متعلق کچھ ہدایات بلاشبہ موجود ہیں' ان میں سے کس کو قدیم کہا جائے اور کس کو جدید قرار دیا جائے؟ یہ فیصلہ بڑا دشوار ہے۔ لیکن اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ دنیا کے ہر علاقے میں قانون دانوں نے اور بین الاقوامی تعلقات منضبط کرنے والوں نے جب ان معاملات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پر غور کرنا شروع کیا تو انھوں نے بھی ان نظائر کو اور بین الاقوامی طور طریقوں کو قانون کی زبان اور اسی کے قواعد و اسلوب پر مرتب کیا۔ آج بین الاقوامی تعلقات کے اصولوں کا ایک قدیم ماخذ ایک قدیم کتاب' ارتھ شاستر ہے جو ارسطو کے ایک معاصر چانکیہ کی مرتب کی ہوئی ہے۔ یہی وہ شخص ہے جو چندر گپت موریا کا وزیر تھا جو ہندستان میں سکندر اعظم کا معاصر حکمران گزرا ہے۔ اس نے اس کتاب میں بین الاقوامی تعلقات اور معاملات کے بارے میں اپنے تجربات' مشورے اور خیالات بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ اسی طرح رامائن اور مہابھارت میں جو بڑی بڑی جنگوں کی داستانیں ہیں' اور رستم و سہراب کے واقعات میں بھی جس کو فردوسی نے اپنے شہرہ آفاق شاہنامے میں مرتب کیا ہے' جابجا وہ ہدایات و قوانین ملتے ہیں جنھوں نے متحارب قوتوں کے درمیان حالت جنگ میں تعلقات کو بہتر رکھنے کی کوشش کی ہے۔

ان مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا میں بین الاقوامی قوانین اور بین الاقوامی تعلقات کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود انسانی تمدن کی تاریخ ہے۔ بین الاقوامی تعلقات کے ان تمام تصورات کا جائزہ لیں تو چند چیزیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ان تمام قوانین میں (جن کو اگر قانون کہنا درست ہو) قانون' اخلاق' معاشرتی ہدایات' قصے' کہانیاں' ادب' شاعری' سب کچھ اس طرح ملا جلا ہے کہ ان کتابوں کو قانون کی کتابیں کہنا بڑا دشوار ہے۔ البتہ قانون کے ماخذ کے طور پر ان کو ضرور قبول کیا جا سکتا ہے۔ ان کتابوں میں بین الاقوامی تعلقات کے جو قوانین بیان کیے گئے ہیں ان کی بنیاد کم و بیش بلااستثنا اس تصور پر ہے کہ یہ قوانین جس قوم کے ہیں' اس قوم کو دیگر اقوام پر ایک نسلی' فطری اور جبلی برتری حاصل ہے۔ ہندوؤں کے ہاں اگر رامائن اور مہابھارت تاریخ ساز کتابیں ہیں تو اس کے ساتھ یہ تصور بھی ہے کہ آریا نسل دنیائے انسانیت پر ایسی برتری رکھتی ہے کہ دنیا کا کوئی انسان اس کی برابری کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ ہندوؤں میں چار ذاتیں ہیں جو ان کے ہاں نسلی برتری پر مبنی نظام کے نمایندہ طبقات ہیں۔ سب سے اعلیٰ طبقہ آریائی نسل کی باقیات ہے جو ہزاروں سال سے ہندستان پر حکومت کر رہا ہے۔ برہمن نسل کی برتری' ہندو نظام اور ہندو معاشرے کے رگ و پے میں شامل ہے۔ ہندو نظام' خواہ دور قدیم کا نظام ہو' یا دور جدید کا' اس کی اساس برہمن طبقہ کی بالادستی پر ہے۔ اور اسی طبقہ کے سیاسی کنٹرول کے سہارے بھارت کا نظام چل رہا ہے۔ یہی حال یونانیوں کے ہاں ہے۔ یونان کا سب سے بڑا فلسفی جس کی عظمت کے سامنے پوری دنیا نے سر تسلیم خم کیا' جس کو مسلمانوں نے انتہائی غیر جانبداری اور وسعت صدر سے عقلیات کا معلم اول تسلیم کیا' یعنی ارسطاطالیس' اس نے اپنی کتاب سیاسیات میں جو اساس قائم کی ہے' وہ یہ ہے کہ غیر یونانیوں کو قدرت نے غلام رہنے اور بننے کے لیے پیدا کیا ہے۔

یہ تصور کہ ہمارے علاوہ تمام انسان دوسرے درجے کے ہیں' ہندوؤں یا یونانیوں کے ہاں ہی نہیں ہے'

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بلکہ یہ مستعمرانہ تصور دنیا کی کئی قوموں میں رائج رہا ہے۔ یورپ میں یونانیوں کے بعد اسے رومن ایمپائر نے بھی اپنایا۔ جب رومن ایمپائر کے قوانین مرتب کیے جا رہے تھے اور بین القوامی اصول و ضوابط کو منظم کیا جا رہا تھا تو انھوں نے پوری نسل انسانی کو دو حصوں میں تقسیم کیا: ایک رومن دوسرے غیر رومن۔ غیر رومنوں کو انھوں نے غیر مہذب قرار دیا اور ان کے لیے ایک نیا قانون مرتب کیا۔ یہ نیا قانون جس کا انطباق دنیا کی تمام غیر رومن اقوام پر ہوتا تھا، وہی قانون ہے جس کو آگے چل کر انھوں نے Droit des Gens یعنی قانون اقوام کا نام دیا۔ یہی وہ قانون ہے جس کی بنیادوں سے اور جس کی کوکھ سے یورپ کے موجودہ بین الاقوامی قانون نے جنم لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں بڑے عرصے تک بین الاقوامی قانون کو فرانسیسی زبان میں قوموں کا قانون، یعنی Droit de Gens اور انگریزی زبان میں Law of Nations کہا جاتا رہا۔

اس سے مراد یہ ہے کہ ہمارے علاوہ دنیا کی تمام اقوام اور قومیں ہم سے کم تر مقام رکھتی ہیں، ان کے لیے قانون علیحدہ ہوگا، اور ہمارے اپنے معاملات کو نمٹانے کے لیے، یا بالفاظ دیگر ہم جیسے برتر لوگوں کے لیے، قانون الگ ہوگا۔ چنانچہ رومیوں نے دو الگ الگ قانون وضع کیے۔ یہ قانون جسے وہ قانون اقوام کے نام سے یاد کرتے تھے، دراصل غیر رومیوں اور "غیر مہذب" کے لیے بنایا گیا تھا اور اسی کی بنیاد پر آج کا بین الاقوامی قانون مرتب ہوا ہے۔ لہٰذا اس قانون کی جنم گھٹی میں "غیر مہذب" لوگوں کو دوسرے درجے کا انسان سمجھنا پڑا ہوا ہے۔

سب سے پہلا بین الاقوامی سیاسی یونٹ جو بین الاقوامی تعلقات کے سلسلے میں قائم ہوا، وہ شہری ریاستیں تھیں۔ یورپ کے مفکرین کا مزاج یہ بن گیا ہے کہ وہ جب کسی بھی چیز کی تاریخ کو ترتیب دیتے ہیں یا کسی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہیں تو ان کی گفتگو کا آغاز بھی یورپ سے ہوتا ہے اور انجام بھی یورپ پر۔ بیشتر مغربی اہل فکر کو یورپ سے باہر نہ دنیا نظر آتی ہے نہ علم و فکر نظر آتا ہے، نہ کسی انسان کا کوئی علمی و عقلی کارنامہ نظر آتا ہے۔ یہی حال بین الاقوامی قانون کے میدان میں بھی ہے۔ وہ بین الاقوامی قانون کا آغاز یونان کی شہری زیاستوں سے کرتے ہیں، جہاں درجنوں شہری ریاستیں اور ان کے علاوہ چھوٹی بڑی، مختلف نظاموں کے تحت چلنے والی ریاستیں موجود تھیں۔ ان کے درمیان سفارتی تعلقات بھی تھے، ان کے درمیان دوسرے مراسم بھی تھے۔ ایک طویل عرصہ، جس کی طوالت کا اندازہ کئی سو سال لگایا جاتا ہے، اس حال میں گزرا کہ ان کے درمیان تعلقات کو منضبط طور پر قائم کرنے کے لیے کوئی ضابطہ یا قانون موجود نہ تھا۔ پھر وہاں کے فلسفیوں اور دانش وروں نے Jus Gentium کے نام سے قوانین مرتب کیے۔ یہ قوانین جن کا کچھ مدون حصہ آج بھی پایا جاتا ہے، بین الاقوامی قانون کے موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں میں موجود ہیں۔ ان قوانین میں جو بات واضح طور پر ملتی ہے وہ یہ ہے اور آج بھی مغربی قانون دان اس کو بلا تامل دنیا کے سامنے پیش کرتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں، وہ یہ ہے کہ یہ قوانین یونانیوں کے آپس کے تعلقات اور میل جول کو مرتب کرنے کے لیے ہیں۔ یہ "غیر مہذب" لوگوں اور غیر یونانیوں کے لیے نہیں ہیں۔

یہ بعینہ وہی بات ہے جو ہندستان کے برہمنوں اور ہندوؤں میں نظر آتی ہے۔ گویا صرف یونانیوں کے ہاں ہی نہیں بلکہ دنیا کی تمام اقوام میں دو طرح کے قانون ہوتے تھے: بین الاقوامی تعلقات کے سلسلے میں ایک نظام قانون تو وہ جو اپنوں کے لیے ہے اور دوسرا قانون وہ جو دوسروں کے لیے ہے۔ اور یہ دوسرا قانون دراصل کوئی باقاعدہ قانون نہ ہوتا تھا بلکہ اس کا صرف ایک اصول تھا، اور وہ یہ کہ ہماری پسند و ناپسند کی بنیاد پر جو معاملہ دوسروں کے ساتھ طے کیا جائے، وہ قانون ہے۔ چنانچہ اس لا آف نیشنز میں بھی جو طے شدہ اصول اور قوانین دیے گئے وہ صرف یونانیوں کے باہمی میل جول کے لیے ہیں۔ یونانیوں کے علاوہ خود یونان میں جو غیر یونانی تھے، مثلاً غلام کہ ان کی ذمہ داریاں کیا ہوں گی، ان کے ہاں اسی سلسلے میں کوئی طے شدہ قانون نہ تھا۔ یونانی غلاموں کے علاوہ دیگر اقوام سے تعلقات کی نوعیت کیا ہو گی؟ ان تعلقات کی کیا بنیاد ہو گی؟ اس سلسلے میں سوائے ان کی ذاتی پسند و ناپسند کے کوئی طے شدہ عقلی بنیاد ہی نہ تھی۔ اس سلسلے میں ان کے قوانین تمام تر صوابدیدی تھے۔

یونانیوں کا دور ختم ہوا اور رومیوں کا دور شروع ہوا اور بہت جلد وہ سلطنت قائم ہوئی جس کا تاریخ میں عظیم رومن ایمپائر کے نام سے ذکر ملتا ہے۔ جس کے مختلف ارتقائی ادوار بیان کیے گئے ہیں۔ عظیم رومن ایمپائر، ھولی رومن ایمپائر، دور متوسط کی رومن ایمپائر وغیرہ۔ یہ ساری کی ساری ریاستیں ایک ہی تصور پر قائم ہیں، اور یہ تصور آج تک مغرب کے نظام بین الاقوام میں موجود ہے۔ وہ یہ کہ رومن ایک بالادست قوم ہے جس کو تمام دنیا پر حکومت کرنے اور تمام دنیا کو غلام بنانے کا اختیار حاصل ہے۔ یہ بات محض کسی فلسفی یا مفکر کے ذہن میں ہی نہیں تھی، بلکہ اسے واضح طور پر الفاظ کی صورت میں لکھا گیا ہے۔ بار بار بیان کیا گیا ہے کہ رومن قوم کرہ ارض کی مالک ہے اور روم سے باہر کی اقوام ان کی مملوکہ قومیں ہیں اور غلام ہیں، ان سے ہر طرح کا معاملہ کرنے کا رومیوں کو اسی طرح اختیار ہے جس طرح ان کے ہاں آقا کو غلام سے ہر طرح کا معاملہ کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے قانون آزاد انسانوں کے لیے ہوتا ہے اور حقوق آزاد انسانوں کے ہوتے ہیں۔ جو غلام ہوتا ہے اس کے لیے نہ قانون ہوتا ہے، نہ مراعات ہوتی ہیں، نہ حقوق ہوتے ہیں۔ اس لیے عظیم رومن قانون ہو یا دور جدید کا قانون بین الاقوام ہو، اس میں ایشیا اور افریقہ کے غلاموں کے لیے طے شدہ قوانین کا کوئی تصور موجود نہیں۔ یہ تمام چیزیں ماضی میں بھی تھیں اور آج بھی ہیں۔

لیکن یہ ایک بڑی عجیب بات ہے کہ رومن ایمپائر میں جس چیز کو آگے چل کر بین الاقوامی قانون کہا گیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے، یہ وہ چیز تھی جس کے ذریعے یورپ کے مختلف ممالک کے تعلقات کو ترتیب دیا جاتا تھا۔ جو سلطنتیں یا ریاستیں یورپ کے مختلف علاقوں میں پوپ کے ماتحت قائم ہوئیں وہ سب کی سب پوپ کی مذہبی برتری اور اعلیٰ سیاسی قیادت کو تسلیم کرتی ہیں اور حاکم اعلیٰ کی حیثیت پاپائے اعظم کو حاصل تھی، حالانکہ ان ریاستوں کے اس قانون کو بین الاقوامی قانون کہنے کی بجائے رومن ایمپائر کا میونسپل لا (Municipal Law) کہنا زیادہ موزوں اور مناسب ہے۔ اس لیے کہ یہ ایک ہی سلطنت کے اندر پائی جانے والی مختلف اقوام کے مابین تعلقات کو منضبط کرتا تھا، آزاد اور خود مختار ممالک یا مختار ممالک یا اقوام کے تعلقات کو نہیں۔ اس کی زیادہ سے زیادہ حیثیت ایک دستوری قانون بلکہ انتظامی قانون کی ہو سکتی ہے۔ یہ بات کئی مغربی مصنّفین نے بھی تسلیم کی ہے کہ اس قانون کو صحیح معنوں میں بین الاقوامی قانون قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے کہ اس کا اطلاق صرف رومن سلطنت کے اندر پائے جانے والی مختلف اقوام پر ہوتا تھا۔

جب رومن ایمپائر نے مسیحیت کا علمبردار ہونا قبول کیا اور مسیحیت کی اس بگڑی ہوئی شکل کو، جس کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کوئی تعلق نہ تھا، اپنا کر ان عقائد و تعلیمات کا دامن تھام لیا جو سینٹ پال کے ذہن کی پیداوار تھیں، تو انھوں نے ایک نیا نظام اور ایک نیا قانون مرتب کرنے کی کوشش کی، جو قدیم رومن ایمپائر کے تصورات سے ماخوذ تھا۔ لیکن یہاں ایک چیز بڑی نمایاں ہے جس کا نوٹس مغربی مصنّفین نے بھی لیا ہے۔ اور یہ اتنی واضح ہے کہ ہر شخص اس کو محسوس کرتا ہے۔ وہ یہ کہ وہ مقدس (Holy) رومن ایمپائر جو عیسائیت کی اساس پر قائم ہوئی، جو ایک مذہبی ریاست تھی، جس میں اقتدار اعلیٰ پاپائے اعظم کو حاصل تھا، جس میں مذہبی قیادت کے ساتھ ساتھ سیاسی قیادت بھی پوپ کو حاصل تھی، جس میں سارے سیاسی و مذہبی حکمران پوپ کے سامنے جوابدہ تھے، جس میں بادشاہوں کے اختلافات پوپ طے کیا کرتے تھے، وہاں توقع کی جاتی تھی کہ بین الاقوامی قانون جو بھی بنایا جائے وہ مسیحی تصورات و تعلیمات کی بنیاد پر بنایا جائے اور وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ان تعلیمات سے مستفاد ہو، جو وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے تھے۔ کم از کم وہ قانون اناجیل اربعہ پر مبنی ہو جو ان کے خیال میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کا مجموعہ ہے۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ مقدس رومن ایمپائر میں جو قوانین مرتب کیے گئے اور خاص طور پر وہ قانون بین الاقوام جو پاپائے اعظم کی زیر سرپرستی ترتیب دیا گیا، وہ دراصل پوپ ہی کے فیصلوں پر مبنی تھا، جس پر ڈیڑھ ہزار سال تک یورپ کی مسیحی ریاستیں عمل کرتی رہیں۔ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کا شائبہ تک موجود نہ تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات میں، جو ان کے مشہور پہاڑی کا وعظ کی صورت میں موجود ہیں، میں کہا گیا ہے کہ اگر تمھارے کوئی ایک تھپڑ مارے تو تم اس کے سامنے دوسرا گال بھی پیش کر دو اور اگر کوئی تمھاری چادر چھیننا چاہے تو تم قمیص بھی اتار کر اس کے حوالے کر دو۔ ان تعلیمات کا فطری تقاضا تو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ تھا کہ قانون جنگ مرتب کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ ایسی قوم میں خادمین اور مخدومین کے حقوق کا سوال بھی پیدا نہ ہونا چاہیے تھا اور نہ جنگی قیدیوں کے حقوق کی بات ہونی چاہیے تھی۔ اس لیے کہ ان تعلیمات پر عمل کرنے کے نتیجے میں نہ جنگ کا سوال پیدا ہوتا ہے، نہ خادمین و مخدومین کا اور نہ جنگی قیدیوں کا۔

لیکن پوری مسیحی دنیا نے اپنے اجتماعی طرز عمل سے حضرت عیسیٰؑ کی اس تعلیم کو جو آج بھی ان کے بیان اور دعاوی کے مطابق حضرت عیسیٰؑ ہی کی تعلیم ہے، ناقابل عمل قرار دے دیا اور ایسا قانون ترتیب دیا جو قدیم یونانیوں اور رومیوں سے ماخوذ ہے، جن کے ورثہ سے آج اہل یورپ لاتعلقی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم تو یہ تھی کہ میری بادشاہت اس موجودہ دنیا کے لیے نہیں ہے، بلکہ آنے والی دنیا کے لیے ہے۔ لیکن عیسائیت کی بنیاد پر اس دنیا میں بادشاہتیں قائم کی گئیں اور ان بادشاہوں نے وہ سارے مظالم روا رکھے جو دنیا کے ظالم بادشاہوں کا طرۂ امتیاز ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ نے ترک دنیا کی تعلیم دی۔ حضرت عیسیٰؑ نے رحمت و رافت کی تعلیم دی۔ لیکن رومن حکمرانوں نے داخلی یا خارجی کسی بھی معاملے میں کسی ایک جگہ بھی حضرت عیسیٰؑ کی ان تعلیمات کو قبول نہ کیا۔ یہودیوں کے بارے میں جو رویہ رومن حکمرانوں نے روا رکھا وہ یہ تھا کہ لاکھوں یہودیوں کو ذبح کر دیا گیا، محض اس جرم میں کہ عیسائی حکمرانوں کی رائے میں انھوں نے خدا کشی کے سنگین جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ چنانچہ اس جرم کی سزا ان یہودیوں کو بھی موت کی صورت میں دی گئی جو حضرت عیسیٰ کے سینکڑوں سال بعد پیدا ہوئے تھے۔ اس انسانی قتل عام کے جرم کے ارتکاب کے وقت عیسائی دنیا کو حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات یاد نہ آئیں۔

یہ ہیں بین الاقوامی تعلقات کے وہ اساسی امور جن پر آج بھی مغرب کے قانون بین الاقوام کی بنیاد ہے۔ یہ قوانین ایک ہزار سال تک یورپ میں جاری رہے۔ اسلام کے آغاز کے ساتھ ہی یورپ میں ان قوانین کا آغاز ہوا اور اٹھارویں صدی کے اوائل تک ان قوانین پر یورپ میں عمل ہوتا رہا۔ یہی وہ قانون تھے جن کو بعد میں ہیوگو گروشیس نے، جس کو مغرب میں بین الاقوامی قانون کا باوا آدم کہا جاتا ہے، یورپ میں مرتب کیا۔ گروشیس کی وفات سترہویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ اس پوری مدت میں کسی غیر یورپی غیر مسیحی کا کسی غیر انسانی سلوک سے بچنے کے لیے ان قوانین سے مستفید ہونا یا ان قوانین میں دیے ہوئے حقوق و مراعات کا مطالبہ کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ خود گروشیس نے ان قوانین کی کامیابی کی جو چار شرائط بتائی ہیں ان میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ قوم جس پر اس قانون بین الاقوام کے احکام منطبق ہوں، وہ کوئی "مہذب" یورپی مسیحی قوم ہو۔ اس صورت حال میں دوسروں کی اوقات پہلے ہی معلوم تھی۔ اگرچہ اسی دور میں عیسائی دنیا سے بہتر دنیائیں روئے زمین پر موجود تھیں، عیسائی معاشرے سے بہت بہتر معاشرے پائے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جاتے تھے، جہاں تہذیب و تمدن کے بہترین مراکز قائم تھے، لیکن مسیحی دنیا کے تعصب نے عیسائی دنیا کو اس طرف دیکھنے کا موقع ہی نہ دیا۔

جب سلطنت عثمانیہ نے مشرقی یورپ کے بیشتر حصے کو فتح کر لیا اور ایک ایک کر کے یورپی سلطنتوں کو زیر کر لیا تو یورپی طاقتوں نے ۱۸۵۶ میں ایک معاہدے کے تحت سلطنت عثمانیہ کو یہ حق دیا کہ وہ اس مغربی بلکہ مسیحی بین الاقوامی قانون کے تحت حقوق و مراعات کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ پھر جب ۱۸۹۵ میں جاپان نے چین کو اور ۱۹۰۵ میں روس کو شکست دی تو پھر جاپان کو بھی ۱۹۰۵ میں بین الاقوامی قوانین سے مستفید ہونے والے ملک کے طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود یورپ کے علمی حلقوں میں اور خصوصاً مذہبی لوگوں میں یہ بحث جاری رہی کہ کیا کسی دیگر قوم کو بین الاقوامی تعلقات کے ضابطہ قانون سے استفادے کا حق ہے بھی یا نہیں۔ پھر حضرت عیسیٰ کی جانشینی کا دعویٰ کرنے والے یورپ میں دو مرتبہ پوپ نکولاس چہارم اور اوربان ششم نے یہ ڈگری جاری کی کہ کسی دیگر قوم سے اس قسم کا معاہدہ کرنا کہ وہ بین الاقوامی قوانین سے استفادہ کر سکے، جائز نہیں اور اگر ایسا معاہدہ کر بھی لیا جائے تو اس کی پابندی کرنا عیسائی دنیا کے لیے قطعاً جائز نہیں ہے۔ اور اگر ایسا کرنا ناگزیر ہو جائے تو کوشش کی جائے کہ اس معاہدے پر کماحقہ عمل نہ کیا جائے۔ یہ وہ ڈگری تھی جو مذکورہ بالا دو پاپاؤں نے جاری کی تھی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یورپ کا مزاج اور اس کی روح بین الاقوامی تعلقات کے سلسلے میں کس انداز کی رہی ہے۔ یہ ہے بین الاقوامی قوانین کا وہ خاکہ جو دوسری اقوام کے بارے میں یونانیوں، رومیوں اور مقدس پاپاؤں کے طرز عمل کی غمازی کرتا ہے۔

۱۸۱۵ میں چار بڑی یورپی طاقتوں کا ایک اجلاس منعقد ہوا تھا جس کا یورپی مصنفین بڑے فخر کے ساتھ ذکر کرتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ بین الاقوامی اتحاد کی یہ پہلی مثال ہے۔ یہ اتحاد جن ممالک اور حکمرانوں کے درمیان ہوا، ان میں شہنشاہ کروشیا، شہنشاہ جرمنی، شاہ آسٹریا اور شہنشاہ روس شامل تھے۔ اس معاہدے کو (Holy Alliance) یا اتحاد مقدس کا نام دیا گیا۔ اس میں تین اصول طے کیے گئے۔ پہلا اصول یہ تھا کہ یورپ اور اس کے قرب و جوار میں کسی مسلمان طاقت کو سر اٹھانے کا موقع نہ دیا جائے گا اور اس میں پہلے قدم کے طور پر سلطنت عثمانیہ کی تباہی میں جو کچھ ہم سے ہو سکا ہم کریں گے۔ دوسرا بنیادی اصول یہ تھا کہ دنیا میں جمہوریت کو حتی المقدور پنپنے نہیں دیا جائے گا۔ تیسرا اصول ان کے داخلی معاملے کے سلسلے میں تھا کہ نپولین بوناپارٹ کی اولاد میں سے کسی کو اقتدار میں شریک نہ ہونے دیا جائے گا۔

یہ مختصر سا تاریخی جائزہ دنیا کے مختلف علاقوں میں بین الاقوامی قوانین کے آغاز و ارتقا کا ہے۔

(جاری)

© rasailojaraid.com